© rasailojaraid.com

شپنگلر کے نظریۂ تمدّن پر ایک نظر

(از جناب عبدالحمید صاحب ضیاء، ایم۔ اے)

نہ معلوم علمی حلقوں میں یہ سوال کتنی بار دہرایا گیا ہے کہ ایک تمدن جو مٹ چکا ہو، کیا اس کے احیاء کی بھی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ شپنگلر اور اس کے ساتھی تمدن کو ایک فرد کی زندگی پر قیاس کرتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ایک انسان کی زندگی کی طرح طفولیت، جوانی اور بڑھاپے کے ادوار میں سے گذر کر موت کی آغوش میں جا گرتا ہے۔ ان کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے:

"تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ایک تمدن جنم لیتا ہے اور کچھ مدت کے بعد عہد طفولیت میں قدم رکھتا ہے۔ اس دور میں اس کے علم بردادوں میں انتہائی جوش و خروش دکھائی دیتا ہے۔ ساری کی ساری کائنات، اور اس کی آغوش میں جتنے واقعات چلتے ہیں، ان میں اس کے متبعین ایک مقصدی ترتیب اور ارادی ربط دیکھتے ہیں۔ افراد اور ان کے عمل و نظر کے زاویوں کی قریب قریب ایک ہی صورت ہوتی ہے۔ اس عہد کی حکومت کی بنیادیں نہایت ہی محکم اور مستحکم نظر آتی ہیں، اور خیالات اور دل و دماغ کی وسعت کے ساتھ ساتھ سلطنت کی وسعت کا افق بھی پھیلتا چلا جاتا ہے ان کا آرٹ ابتدائی اور ناتراشیدہ ہونے کے باوجود قوت بخش ہوتا ہے اور سفر کے اسی راستہ پر گامزن ہو کے تمدن دور شباب میں داخل ہوتا ہے۔

یہ دوسرا دور علم و ادب کا زرین زمانہ کہلاتا ہے۔ خدا پر ایمان راسخ اور گہرا ہونے کی وجہ سے افراد کے دل و دماغ کے ہر ریشہ میں سرایت کرتا ہے۔ اس ماحول میں سانس لینے والے انسان خدا کو انسانی شکل دینے کے جذبے کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ کائنات اور اس کے مختلف مشاہدات میں اب بھی ایک ربط محسوس کیا جاتا ہے۔ حکومت کے لیے دلوں میں انتہائی پاسداری موجود ہوتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سماج کا اعلیٰ طبقہ پُرشوکت اور شائستہ زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ عہد اپنے آپ کو پانچویں صدی قبل مسیح کے ایتھنز، قیصر آگسٹس کے روما اور اٹھارویں صدی کے فرانس میں جلوہ گر پاتا ہے۔

ترقی کے یہ سارے منازل طے کر چکنے کے بعد پھر انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ علم و ادب کے سارے چشمے خود بخود سوکھ جاتے ہیں سنہری دور نقرئی دور میں بدل جاتا ہے۔ چالاکی اور عیاری قوم کی تخلیقی قوتوں کی جگہ لے لیتی ہے حکومتیں جو جمہوریت کا مظہر اتم ہوتی ہیں آمریت کے سانچوں میں ڈھل جاتی ہیں اور اپنی قوت کے پودوں کی سونے چاندی کے پانی سے آبیاری کرنے لگتی ہیں۔ خداوند عالم سے جس قدر رشتے ہوتے ہیں بالکل ٹوٹ جاتے ہیں۔ کائنات میں جو ہم آہنگی نظر آتی ہے وہ پردۂ غیب میں منہ چھپا لیتی ہے۔ انسانی زندگی بلند ترمقاصد سے گر کر عیش پسندی کے معیار پر گھومنا شروع کر دیتی ہے اور کسی بیرونی دشمن کے ایک ہی بھرپور حملے سے تمدن کی یہ عمارت پیوندِ خاک ہو جاتی ہے۔

اس مدرسۂ فکر کے خیال میں سب تمدنوں کے ساتھ تقریباً یہی معاملہ ہوا۔ مصر کے مقبروں سے اہرامی تہذیب پیدا ہوئی؛ پھر اُسے بھی زوال ہوا۔ یونان کے فکری کھنڈرات سے روم کا عظیم الشان قانون اُبھرا، پھر اس پر بھی موت طاری ہو گئی۔ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ ہزاروں نہیں، لاکھوں قومیں مختلف تمدنوں کی علمبردار بن کر اس دنیا کے اسٹیج پر اُبھریں۔ تاریخ کے صفحات نے ان کا خیر مقدم کیا، وہ بڑھیں اور ان کے افکار و نظریات پھلے پھولے، انھوں نے طاقت کو غلام بنایا اور دنیا پر چھا گئیں پھر جب موت کی ساعت آئی تو ہمیشہ کے لیے سو گئیں۔ بچاؤ کے سارے حیلے پھر اس تنزل کو باز نہیں رکھ سکے، کیونکہ یہ اُن کی اجل تھی، اور جب اجل آ جاتی ہے تو ٹل نہیں سکتی۔ تاریخ کے اوراق ہی پھر ان کے مدفن بھی بنے۔ اب ان گزری ہوئی اقوام کی جامد روایات باقی ہیں۔ ایک تن جس سے جان نکل چکی ہو اُس کے لیے بقراط و جالینوس کی حکمت بھی چارہ گر نہیں ہو سکتی۔ بالکل اسی طرح ایک تمدن جو مٹ چکا ہے، اس کے لیے احیاء کی جدوجہد بالکل بے سود ہے اور اس سلسلہ کی تمام کوششیں ناکام و نامراد ثابت ہوں گی۔

تمدن کی ماہیت | یہ ہے تمدن کے متعلق وہ نظریہ جو سپنگلر نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "زوالِ مغرب"[۱] میں

---

۱ Decline of the West by Oswald Spengler.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیش کیا ہے۔ تمدن سے متعلق ان کے نظریے کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ تمدن سے اس کی مراد اخلاقی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور بین الاقوامی قوانین کی ظاہری اور خارجی نمود ہے جو کسی قوم کی زندگی میں جلوہ گر ہوتی ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمدن کا بڑا ہی سطحی تصور ہے۔ تمدن محض ان سطحی، خارجی اور محسوس شعائر کا مجموعہ نہیں ہے جو ایک قوم کے باشندوں میں دیکھے جاتے ہیں، بلکہ ہر قسم کے تمدن کی اصل جڑ انسانی ذہن میں لگی ہوتی ہے جس سے ظاہری واقعات کی یہ ساری کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ تمدن کی اس جڑ کا نام تہذیب ہے جو دراصل عبارت ہے اس خاص ذہنی میلان یا اندازِ فکر سے جو ایک خاص قسم کی سیرت و کردار پر منتہی ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ وہ کسی قوم کا ایک مخصوص اخلاقی اور عقلی مزاج ہے جس کی بنا پر اس کے بیشتر افراد عام حالات میں ایک مخصوص طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یورپ کی موجودہ اقوام اور یونان و روما کی گزری ہوئی قوموں کے تمام تمدنی اختلافات کے باوجود ہم ان میں ایک ہی تہذیب کارفرما پائیں گے، کیونکہ جن فکری اور اخلاقی عناصر سے ان کی سرشت کا خمیر اٹھایا گیا ہے وہ سب میں یکساں و مشترک ہیں۔ گزری ہوئی قوموں کو تو فی الحال نظرانداز کیجیے۔ موجودہ دور کی انگریزی، امریکی، جرمن، فرانسیسی اقوام پر ایک نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے اساسی مسائل ایک جیسے ہیں۔ اور ان کے حل کرنے کے طریق اگر ظاہر میں نہیں تو کم از کم اپنی اخلاقی و ذہنی روح کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت حد تک ملتے جلتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان سب ممالک میں ایک فرد کے ساتھ دوسرے فرد کے تعلقات کو، سرمایہ اور محنت کے روابط کو، سماج اور فرد کے رشتے کو ایک ہی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر کیوں ان میں اس قدر مماثلت اور یگانگت دکھائی دیتی ہے؟ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان سب ممالک کے باشندوں کے ذہنوں پر مادہ پرستی سوار ہے اور فکر و عمل کے سارے دھارے اسی مادہ پرستی کے چشمے سے ابلتے ہیں۔ اور یہ مادہ پرستانہ ذہنیت صرف معاشی میدان میں ہی نظر نہیں آتی بلکہ ان کی زندگی کے خالص مذہبی اور اخلاقی خانے بھی اسی کی رنگینیوں سے جگمگا رہے ہیں۔ ان کی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جس میں یہ ذہنیت اپنے آپ کو پوری آب و تاب سے منعکس نہ کرے۔ اس سلسلے میں یہ بھی یاد رہے کہ تمدن ایک مربوط نظامِ فکر و عمل ہوتا ہے جس کے مختلف شعبوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیش مشترک روحِ تہذیب کی وجہ سے پوری ہم رنگی و یکانگت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ جدید تمدن کا تجزیہ کرنے سے ہمیں معلوم ہوگا کہ جس اساس پر اس کی سر بفلک عمارت اٹھائی گئی ہے وہ محسوس پرستی، الحاد اور مادہ پرستی ہے۔ تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ تمدن بنتے اور بگڑتے رہے ہے، مگر ایک ہی روحِ تہذیب بار بار مختلف قوموں کے تمدن میں ظہور کرتی رہی۔ جب چین کی پرانی تہذیب کو زوال آیا تو اسی بنیاد پر یونانی تہذیب نے جنم لیا، اور جب یونانی اور رومی تہذیب بھی اپنے متبعین کی باہمی منافرت اور جنگ و جدل کی وجہ سے مٹنے لگی تو پھر مشرقِ بعید میں ویسی ہی تہذیب اگلے دو تین سو سالوں میں معرض وجود میں آگئی۔ تہذیبوں کی تکرارِ ظہور آخر وہ کیا اسباب ہیں جن کی بنا پر ایک ہی تہذیب مختلف قوموں کے تمدن میں بار بار جلوہ گر ہوتی ہے؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ جو قوم بھی کسی نظریۂ حیات کو اپنا کر اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لیتی ہے اس قوم کے افراد میں اسی کے مزاج سے مناسبت رکھنے والے سیرت و کردار نمودار ہوتے ہیں۔ جب ایک قوم کے افراد عادتاً ایک ہی طرح کے عمل کرتے ہیں تو یہ اس قوم کا تمدن کہلاتا ہے، اور وہ ذہنی ساخت جس کی وجہ سے اس قسم کے عمل ظہور میں آتے ہیں وہ اس کی بنیادی تہذیب ہے۔ تمدن درحقیقت تہذیب کا ایک خاص جغرافیائی ماحول میں محسوس عملی ظہور ہے۔ زمان و مکان کے اختلافات ممکن ہے دو تمدنوں کی ظاہری شکلوں میں، جن کی اساس ایک ہو، بڑا نمایاں فرق پیدا کر دیں لیکن ان کے حاملین کا اگر تہذیبی نقطۂ نظر ایک ہے تو ان کے تمدن کی مختلف شکلوں میں بھی بہت حد تک بنیادی مماثلت اور یکانگت دکھائی دے گی۔ اگر ہم تمام دنیا کے تمدنوں کو خدا شناسی اور خدا ناشناسی کے اعتبار سے تقسیم کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ایک قسم کے تمدن چاہے مختلف ادوار میں کتنے ہی مختلف ناموں سے پکارے گئے ہوں مگر روح کے لحاظ سے وہ ایک ہی طرح کے رہے ہے۔ انسانی فطرت میں کوئی اساسی فرق واقع نہیں ہوا۔ وہ جوں کی توں ہے۔ خارجی مسکن بدل جانے سے کوئی حقیقت نہیں بدل سکتی۔ مادی کارخانوں میں تخریب و تعمیر کا جو ہنگامہ برپا ہے، بگاڑ اور بناؤ کا جو فلم دکھایا جا رہا ہے، زوال و کمال کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے، یہ محدود سے محدود اور وسیع سے وسیع میدانوں میں ایک ہی

Civilization on Trial by A. J. Toynbee.

© rasailojaraid.com

شہادت فراہم کرتا ہے یہ کہ اس ظاہری پردۂ فلم پر انسانی فطرت اور اس کے شعوری خصوصیات اور غیر شعوری جذبات و ہیجانات چھپے چھپے عکاسی کر رہے ہیں، اور انجان یہ جاتا ہے کہ اس پردے پر کوئی تغیر واقع ہو رہا ہے۔ انسانی عمل کے سارے کے سارے محرکات محبت، شہرت، بھوک، کبریائی کی دھن، جذبۂ خدمت، سماج کی پاس داری، توفیق خدا پرستی ہر عہد میں بر سر عمل رہے ہیں — چاہے ان کے اثر کی پرچھائیوں میں کتنا ہی سمٹاؤ اور کتنا ہی پھیلاؤ کیوں نہ ہو مگر ان محرکات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ جو نیکی یا بدی اس کرۂ ارضی پر ایک دفعہ عمل میں آ چکی ہے وہ اپنے آپ کو دہراتی چلی آ رہی ہے۔ اور نہ معلوم یہ چکر کب تک جاری رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نیکی اور بدی بار بار ابھرتی اور دبتی ہے، مگر یہاں ماضی ہی استقبال کا بھیس بدل کر حال کے سٹیج پر رونما ہوتا ہے اور سطح بین آنکھیں یہ گمان کرنے لگتی ہیں کہ یہ کوئی نیا کھیل ہے جو کھیلا جانے لگا ہے جس کا کوئی تعلق بھی گزرے ہوئے زمانوں سے نہیں۔ دراصل یہ زندگی کی حقیقت سے سخت ناانصافی ہے۔ جنگ و جدال اور گروہ بندی جب سے دنیا قائم ہے، موجود ہے اور اسے دنیا سے بالکل مٹایا نہیں جا سکا۔ مثال کے طور پر امریکہ کی خانہ جنگی نوعیت کے اعتبار سے کوئی بے مثال واقعہ نہیں۔ اس سے ملتے جلتے ہزاروں واقعات تاریخ عالم میں رونما ہو چکے ہیں۔ جن واقعات کا امریکہ کی خانہ جنگی میں ظہور ہوا وہی بسمارک کی جنگوں میں جرمنی کی سرزمین میں ۱۸۶۴ء-۱۸۷۱ء کے درمیان دہرائے گئے۔ دونوں ملکوں میں نامکمل سیاسی اتحاد ہی خطرے کا باعث بنا، دونوں ممالک میں اس اتحاد کا شیرازہ بکھرنے اور پھر اس اتحاد کے دوبارہ قائم ہونے کا آخری فیصلہ قاضیٔ شمشیر نے کیا، دونوں میں اتحاد کے حامیوں کی جیت ہوئی، اور فتح کی وجہ ان کی فنی اور صنعتی برتری تھی، پھر دونوں ممالک میں فتح کا نتیجہ ملک میں صنعتی ترقی تھا، جس نے دونوں قوموں کو انگلستان کا تجارتی میدان میں رقیب بنا دیا۔

واقعات کی اس تکرار کی مثال انگلستان کا صنعتی انقلاب ہے۔ آغاز کے وقت یہ بالکل اپنی مثال آپ تھا۔ مگر ۱۸۷۰ء کے بعد بہت سی یورپین اور غیر یورپین قومیں انقلاب کے اسی چکر میں سے گزریں۔ جو جو فوائد اور مصائب انگلستان کو پیش آئے تھے وہ انہیں بھی پیش آئے۔ انقلاب کی مضرتیں اور سہولتیں سب کی سب انہیں بھی نصیب ہوئیں۔

© rasailojaraid.com

آپ اگر صنعتی دائرہ سے نکل کر سیاسی میدان میں بھی دیکھیں گے تو وہاں بھی آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے اضلاع متحدہ امریکہ اور جرمنی کی تہذیب کینیڈا میں دہرائی جا رہی ہے۔ عہد جدید میں ہی دیکھیں گے کتنے وفاقی اتحاد قائم ہوتے ہیں۔ اور پھر ان میں کتنے صنعتی انقلابات آتے ہیں۔ صنعتی انقلاب کا ڈرامہ پہلے انگلستان میں کھیلا گیا، پھر اسی کا اعادہ امریکہ اور جرمنی میں ہوا۔ اسی طرح فیڈرل یونین کا قیام پہلے امریکہ میں ہوا اور اب آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور برازیل میں اس کا ظہور ہوا ہے۔[1]

ممکن ہے کہ ان سب ممالک میں جہاں ان واقعات کو دہرایا گیا ہے ان کے جغرافیائی حالات کی وجہ سے واقعات میں کسی حد تک کوئی فرق آ گیا ہو۔ مگر وہ فرق ظاہر میں ہوگا، بنیادی نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ انسان کی بنیادی فطرت ہر ملک اور ہر عہد میں ایک ہی رہتی ہے۔ انسانی فطرت جن ناقابل تغیر خصوصیات پر مبنی ہے وہ امتداد زمانہ اور تغیر احوال کے باوجود یکساں اور غیر تبدیل ہے۔ لہٰذا انسانی تاریخ میں کوئی چیز نئی نہیں۔ کیونکہ جو قوتیں اس کی تعمیر کرتی ہیں یعنی انسانی احساسات اور جذبات اور معاشی اور عقلی مقتضیات، وہ باایں ہمہ اختلاف زمان و مکان یکساں ہیں۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ ظاہر میں ہے باطن میں نہیں۔ تہذیب کے جس قافلہ نے غاروں سے محلات تک، پتھر کے اوزاروں سے جوہری بم تک، گدھوں اور ٹٹوؤں کی سواری سے ریلوں اور ہوائی جہازوں تک، برہنگی سے دیبا و حریر کے لباسوں تک، تصویری نقوش سے طباعت تک ترقی کی ہے اس کو سرگرم عمل کرنے والی اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف شوق تجسس، سبقت اور تعمیر کا ذوق ہے جس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اگر کچھ فرق ہوا ہے تو ان کی قوت کار کردگی میں۔ بیل گاڑی ہانکنے والے ابن آدم کے احساسات بھی دراصل محدود پیمانے پر بالکل ویسے ہی تھے جیسے وسیع پیمانہ پر موٹر چلانے والے خاکی پتلے کے۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ رفتار اور ساخت کا ہے۔ جو محرکات آج ہمیں جنگ اور صلح، دوستی اور دشمنی، تعمیر اور تخریب کی طرف لے جاتے ہیں، وہ ان محرکات سے کسی طرح مختلف نہیں جو ازمنۂ گذشتہ کے انسانوں کو اسی طرف لے جاتے تھے۔ وہ جذبۂ رقابت جو زمانہ قبل از تاریخ کے وحشیوں میں پایا جاتا تھا وہی آج کے مہذب انسانوں میں موجود ہے۔

---

[1] Civilization on Trial by A. J. Toynbee.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر کل غاروں میں رہنے والے غیر مہذب انسان شکار کئے ہوئے گوشت کی تقسیم پر آپس میں سر پھٹول پر آمادہ ہو جاتے تھے تو آج منڈیوں اور نو آبادیوں پر قبضہ جمانے کے لیے اُن سے زیادہ درندگی اور شقاوتِ قلبی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ کل اگر جنگ پتھروں اور تیروں سے ہوتی تھی تو آج ایٹم بم اور کاسمک ریز ایجاد کرلی گئی ہیں۔ فرعون تو صدیاں ہوئیں دنیا سے نیست و نابود ہو چکا ہے، مگر فرعونیت اپنی پوری آب و تاب سے دنیا میں جلوہ گر ہے۔

تمدن کی ایک خاص روح ہوتی ہے جو ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ زندگی کی یہ چنگاری دب سکتی ہے لیکن بجھ نہیں سکتی۔ بس ذرا سی ہوا دینے سے از سر نو اسی طرح بھڑک اٹھتی ہے جس طرح پہلے کبھی بھڑکی تھی۔ جس طرح انسانوں کی فطرت چند افراد کے مرنے سے نہیں مرتی بلکہ وہی فطرت اپنا مظہر اُسی قسم کے اور انسانوں کو بنا لیتی ہے، بالکل اسی انداز میں اجتماعی روح ایک قالب کو چھوڑتی ہے تو دوسرے میں جا گزیں ہو جاتی ہے۔ اور پھر نئے اختیار کردہ سماج میں ٹھیک اسی طرح کے مظاہر پیدا کرتی ہے۔ آئیے ہم ان واقعات کا تاریخ کی روشنی میں مطالعہ کریں۔

تمدن اور فنون سب سے پہلے ہم کسی قوم کے فنون کو لیتے ہیں — کیونکہ یہ فنون ہی وہ سب سے زیادہ حساس آئینے ہیں جن میں ایک قوم کی روح بالکل واضح طور پر منعکس ہوتی ہے۔ سماج کے افراد میں جس قسم کے رجحانات ہوں گے اُسی طرز پر اُن کے آرٹ کی تکمیل ہو گی۔ خدا شناس تمدن کے اندر جو فنون ترقی پائیں گے اُن کی خصوصیتِ اوّل ہی یہ ہو گی کہ انسانی زندگی کو خدا کی مرضی کا پابند بنایا جائے۔ یہاں چونکہ تمدن کے بنیادی فلسفے کی رو سے انسان دنیا میں خدا کا نائب ہے، اس لیے یہ آرٹ انسانوں کو خدائی اخلاق اپنے اندر پیدا کرنے پر اُبھارتا ہے۔ وہ انسانوں کو نیکی کی تلقین کرتا ہے اور تعمیر پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس خدا ناشناس تمدنوں کے فنون ہر اُس چیز پر زور دیتے ہیں جو نیکی، صداقت، راست بازی اور انسانیت کی ضد ہو۔ وہ انسانوں کو بہیمیت اختیار کرنے پر اُکساتے ہیں۔ اس کے دیوتا کبھی بدمعاش، مجرم، عیار اور زانی ہوتے تھے۔ اب وہی کچھ اس کے ہیرو ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد زیادہ سے زیادہ شہوانی جذبہ کو ابھارنا ہوتا ہے۔ اب جہاں کہیں خدا ناشناس تمدن گیا اس کے ساتھ اسی قسم کے فنون نے ترقی کی۔ یہ آرٹ آزمنۂ گذشتہ

© rasailojaraid.com

ے بہت سے قبائل کا، پرانے مصریوں کا، اور روم اور یونان کے وسطی دور میں بسنے والوں کا تھا۔ اور پھر یہی مغربی دنیا میں پچھلے پانچ سو سالوں سے پوری آب و تاب سے جلوہ افروز ہے۔ اسی طرح خدا شناس تمدن نے فنون کو اپنی روح سے متاثر کیا۔ یہ اپنی مخصوص صفات کے ساتھ دنیا میں ابھرا۔ یہ آرٹ کچھ وقت تک تبتیوں میں، بدھ مذہب کے پیروؤں میں، پرانے مصریوں میں اور یونان کے اندر نویں صدی قبل مسیح سے چھٹی صدی قبل مسیح تک پایا گیا ہے۔ پھر جہاں جہاں عیسائیت اور اسلام گئے وہاں اس آرٹ کی ترقی ہوئی۔

نظامِ زندگی پر تمدن کے وسیع اثرات تمدن کی روح صرف آرٹ میں ہی جلوہ گر نہیں ہوتی بلکہ علم و سیاست، معیشت و معاشرت پر بھی اس کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ یہ اپنے ماننے والوں میں ایک ہی طرح کی ذہنیت پیدا کرتا ہے۔ جب ہم ایک مادی تمدن کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی بنیاد ہی حسیات اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج پر رکھی گئی ہے۔ انسانوں کے لیے اس سے زیادہ آسان اور عام بنیاد اور کوئی نہیں۔ اس سے زیادہ انسانوں کی حیوانی خواہشات کو تسکین دینے والا کوئی نظام نہیں۔ اس لیے یہ عام انسانوں کے لیے سب سے زیادہ کشش کے سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس تمدن کی تحلیل کر کے اگر ان اجزا کو خارج کر دیا جائے جو اصل نہیں، بلکہ فروعات اور مظاہر ہیں، تو ہم اس کا ایک مخصوص مزاج پاتے ہیں، جس کی خصوصیات غیر محسوس حقائق کی بے وقعتی اور ان سے استغناء، خشوع و خضوع اور روحانیت کی کمی، دنیاوی زندگی کی پرستش، اور دنیا کے فوائد و لذائذ کا اہتمام، شدید حُب الوطنی، اور گروہی عصبیت میں افراط و غلو ہیں۔

اب دیکھیے کہ جہاں جہاں یہ تمدن اپنایا گیا زمان و مکان کے وسیع اختلافات کے باوجود اس نے ہر جگہ اور ہر قوم میں ایک ہی قسم کے اثرات چھوڑے۔ باقی افعال کو تو جانے دیجیے، نقشۂ حیات کے خالص مذہبی اور روحانی خلا نے بھی اسی مادہ پرستانہ ذہنیت سے تابندہ ہو جاتے۔ اس کی روح اسے اپنانے والی قوم کے رگ و پے میں کچھ اس طرح سرایت کر گئی کہ اس کے افراد کا ہر شعوری اور ارادی فعل اسی کی غمازی کرنے لگا۔

The Crisis of Our Age by Pitirim A. Sorokin. لہ

© rasailojaraid.com

جہاں تک تاریخ ہماری رہنمائی کرتی ہے سب سے پہلی قوم جس نے اس تمدن کو اپنایا وہ جزیرۃ العرب کی ایک قوم "عاد" تھی۔ اس قوم کی زندگی ایک خالص خدا ناشناس اور منکرِ آخرت قوم کی زندگی تھی۔ وہ بے ضرورت لطف و تفریح یا نام و نمود کے لیے بڑی بڑی عمارتیں اور یادگاریں تعمیر کرتے تھے جن کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بنانے والے آخرت کو یکسر فراموش کر چکے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ان کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے۔ ان کی دارو گیر سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے سوا کسی بلند و بالا طاقت کا یقین نہیں رکھتے۔

اُس کی جانشین قوم "ثمود" نے بھی اسی تمدن کا خیر مقدم کیا۔ اس قوم کے افراد کا بھی دنیوی زندگی میں انہماک اور اس ہی اُن کے سکون و اطمینان، اُخروی زندگی سے غفلت اور اس معاملہ میں ان کی بے سرو سامانی دیکھ کر اسی کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے تھے جو ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو۔ حسیت و مادیت ان کا اصل شعار تھا۔

رومی تمدن بھی اسی حسیت اور مادہ پرستی کا شاہکار ہے۔ اس میں بھی حسی فلسفۂ اخلاق و اجتماع، مادہ پرستانہ مقصدِ زندگی اور طرزِ زندگی پورے طور پر نمایاں ہیں۔ اور خیالات و افکار، علوم و فلسفہ اور تمدن و تہذیب کا یہی ترکہ ہے جو مغرب کو میراث میں ملا ہے۔ رومی تہذیب کی عمارت انہی بنیادوں پر تعمیر ہوتی تھی اور آج مغربی تہذیب کی سر بفلک عمارت بھی اسی اساس پر اٹھائی گئی ہے۔ دنیا طلبی اور شکم پروری کا طوفان دونوں میں ایک ہی طرح کا ہے۔ مال و دولت کی ایک نہ مٹنے والی بھوک اور نہ بجھنے والی پیاس دونوں میں ایک ہی جیسی ہے۔ دولت اور عزو جاہ کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار اگر رومی و یونانی تہذیب میں ناکافی محسوس ہوتی تھی تو آج بھی دنیاوی لذائذ کی اونچی سے اونچی سطح بھی انسان کی تشفی نہیں کر سکتی۔

جدید تہذیب کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک نومسلم مفکر نے کہا ہے: "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ میں اس وقت بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو دینی طرز پر سوچتے ہیں اور مذہبی احساس رکھتے ہیں اور اپنے عقائد کو اپنی تہذیب کی رُوح کے ساتھ منطبق کرنے میں امکانی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ مستثنیٰ مثالیں ہیں۔ یورپ کا عام اور متوسط آدمی، خواہ وہ جمہوری ہو یا فاشستی، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہاتھ سے کام کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا، وہ ایک ہی مذہب جانتا ہے۔ وہ کیا؟ مادی ترقی کی پرستش! اور یہ عقیدہ کہ اس زندگی کی غرض وغایت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ آسان اور پُرراحت اور بے قید بنایا جائے۔ اس مذہب کے گرجے اور عبادت گاہیں زبردست کارخانے، تھیٹر، تفریح گاہیں، کیمیاوی دارالصنعت، ناچ گھر اور بجلی کے مراکز ہیں! اس مذہب کے پروہت بینکوں کے ڈائرکٹرز، انجینئرز، علم اسٹارز اور تجارت وصنعت کی بڑی بڑی مرکزی شخصیتیں اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں۔ طاقت ولذت کی اس ہوس اور چھچھورپن کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ حریف گروہ سامانِ جنگ سے لیس اور جنگی تیاریوں سے مکمل تیار کھڑے ہیں اور ایک دوسرے کو تباہ کر دینے کے لیے پَر تول رہے ہیں۔ اب اگر ان کی خواہشات اور مصالح میں تصادم ہو گیا تو کون جانے کیا ہوگا! جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے، انسانوں کا ایک ایسا ٹائپ پیدا ہوا ہے جس کا عقیدہ ہے کہ نیکی اور اخلاق نام ہے مادی فائدے کا۔ اس کے نزدیک کامیابی کا معیار محض مادی کامیابی ہے[1]۔"

<u>تہذیب کے اصولوں کا بار بار نمودار ہونا</u> یہ تو ہوا اقوام کا مزاج اجتماعی جس میں اس قدر یگانگت دیکھنے میں آتی ہے۔ آئیے اب تہذیب کے چند اصولوں کو لیجیے اور پھر دیکھیے کہ یہ مسائل کس طرح ہمارے سامنے بار بار اُبھرتے رہے ہیں اور ایک ہی نظریۂ حیات رکھنے والی مختلف اقوام کس طرح شعوری یا غیرشعوری طور پر ان مسائل کو ایک ہی طرح سے حل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

بطورِ مثال ایک سوال کو لیجیے کہ فرد اور اجتماع کا رابطہ کیا ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عہدِ قدیم میں کوئی واضح اور مضبوط نظام نہیں تھا لیکن یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہاں نظم اجتماعی کی کوئی ہیئت ہی نہ ہو۔ اس نظام نے انفرادی آزادی کو انتہا تک پہنچا دیا تھا یعنی اجتماعی ہیئت فرد کے سامنے بالکل بے بس تھی پھر اس کا روما کے اندر شہنشاہیت کی شکل میں ردِ عمل ہوا۔ فرد کی شخصیت بالکل اجتماعیت کی محکوم بن کر رہ گئی اور فرد کی جان ومال قوم اور ملک کی بھینٹ چڑھنے لگی پھر انقلابِ فرانس کے دور میں واقعات نے یک لخت پلٹا کھایا اور فرد کو مکمل آزادی نصیب ہوئی۔ پھر اشتراکی روس اور نازی جرمنی

[1] Islam at the Cross roads by Mohammad Asad.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اس کے خلاف تحریکات اٹھیں اور فرد اجتماعیت کے طوفان میں بالکل غرق ہو کر رہ گیا۔ جرمنی کے وزیر دخلہ نے کہا تھا کہ ہٹلر کی خدمت کرنا جرمنی کی خدمت کرنا ہے، اور جرمنی کی خدمت کرنا خدا کی عبادت ہے۔

اشتراکی ریاست اس سے بھی ایک قدم آگے ہے۔ وہاں انسانوں کو حکومت کی رکشا میں صرف جوتا نہیں جاتا بلکہ ان کے دل و دماغ پر مکمل قبضہ کر کے ان کے جذبات اور احساسات تک کی مکمل منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ آپ روس کے صدر کو جس نام سے چاہیں پکاریں۔ مگر اس کے اختیار اور اقتدار کا دائرہ کسی طرح ہٹلر اور مسولینی سے کم نہیں۔ اس کی ہر بات روس کا قانون ہے۔ ہٹلر اور سٹالین ایک ہی سیاسی تہذیب کے دو مظہر ہیں، اگرچہ باہم برسرپیکار نظر آتے ہیں۔ فاشزم اور کمیونزم سیاسی منصوبہ بندی ہی کے دو پہلو ہیں۔ اگر نپولین بونا پارٹ اپنے عہد میں خفیہ پولیس کے سہاروں پر زندہ رہا، اگر قرونِ وسطیٰ کے بادشاہ تلواروں کی مدد سے مسندِ اقتدار پر متمکن رہے تو آج کی دنیا کا سٹالن بھی گے پی یو کے بل بوتے پر جی رہا ہے۔

مزید مثال کے لیے انسان کے صنفی رابطے کو لیجئے۔ دورِ وحشت میں یہ تعلق بالکل جانوروں کی طرح تھا۔ جہاں جذبات میں ذرا سی تحریک ہوئی صنفِ مخالف کے کسی فرد سے استفادہ کر لیا۔ اس دور سے ذرا آگے نکل کر نکاح کے معاہدے کو صنفی تعلقات کی اساس بنایا گیا۔ پھر خاندان معرضِ وجود میں آیا۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد موجودہ علوم کے باوا آدم یعنی افلاطون نے دورِ جاہلیت کے صنفی تعلقات کی طرف عوام کو پھر دعوت دی۔ اس نے تجویز کیا کہ مقررہ اوقات پر تندرست مردوں اور عورتوں کو یکجا کر دیا جائے۔ ان کے اختلاط سے جو اولاد پیدا ہوگی ان کو اپنے ماں باپ کا علم نہیں ہوگا۔ ریاست ان بچوں کی خود پرورش کرے تاکہ ہر نئی نسل پرانی نسل کو اپنا والدین سمجھے اور کسی شخص کی محبت و عطوفت کا مرکز کوئی خاص بچہ نہ ہو سکے۔ اس طور پر ملک میں محبت و ہمدردی کا عام جذبہ پیدا ہو گا[۱]۔ کتنی بڑی فاش غلطی ہے اور کتنا بڑا عاقل شخص ریاست کے مفادِ عمومی کی بے پناہ محبت میں کس طرح اعتدال کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ رہا ہے!

کچھ مدت کے بعد خاندانی سسٹم کی جڑیں پھر مضبوط ہو گئیں۔ لیکن دورِ جدید میں پھر بادِ مخالف چلی

---

[۱] Plato—the Republic Book V, VI, VII.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور خصوصاً اشتراکی انقلاب کے آغاز میں تو صنفی انارکی کا وہ طوفان اٹھا جس نے زمانہ جاہلیت کی یاد از سر نو تازہ کر دی۔ اس کے ثبوت کے لیے "سویٹ اشتراکیت بہ حیثیت ایک نئی تہذیب کے"[1] سے ایک عبارت نقل کی جاتی ہے:۔

"بالشوک نظام کے چند ابتدائی سالوں میں یہ خیال عام تھا کہ صنفی تعلق ایک ایسا ذاتی معاملہ ہے جو مختلف نسلوں، رنگوں اور مذہب کے حامی مردوں اور عورتوں میں اُن کی باہمی رضامندی سے طے ہوتا ہے۔ اس کے لیے سرکاری اندراج بھی ضروری نہیں۔ یہ جوڑے کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے"

چند سال گزرنے کے بعد لوگوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی ہوئی۔ لینن نے صنفی روابط میں آوارگی کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اُسے اِس نظریہ سے شدید اختلاف تھا کہ صنفی جذبات کی تسکین پانی کا گلاس پی لینے کے مترادف سمجھی جائے۔ ریازانوف (Ryazanov) نے کہا "کیا نکاح دو ٹانگیں رکھنے والے جانوروں کے درمیان ایک ذاتی معاملہ ہے جس کا تعلق محض ایک مرد و عورت سے ہے اور جس میں سماج کو دخل اندازی کا کوئی حق نہیں پہنچتا؟ ہمیں نوجوان اشتراکیوں کو سمجھانا ہے کہ عقد نکاح کسی فرد کا کوئی ذاتی فعل نہیں بلکہ معاشرتی نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ نکاح کے دو پہلو ہیں ایک ذاتی، دوسرا معاشرتی۔ اور ہمیں اس کے معاشرتی پہلو کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا ہے۔ ہم آوارہ زندگی کے سخت مخالف ہیں کیوں کہ اِس کا اثر بچوں پر پڑتا ہے"[1] چنانچہ "بعد از خرابی بسیار" خاندان اور نکاح کے نظام کو اب پھر سے وہاں زندہ کیا جا رہا ہے۔

آگے چلیے شوریٰ اور جمہوریت کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے۔ یہ نعمت عظمیٰ تو بالکل جدید دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ عرب، یونان اور قرون وسطیٰ کے ہندوستان سے بھی آگے نکل جایئے اور زمانہ قبل از تاریخ میں اُس کا سراغ لگایئے تو وہاں بھی جمہوریت اور شورے کے تحائف موجود ملتے ہیں۔ یہ سب حقائق

[1] Soviet Communism—A New Civilization by Sidney and Beatrice Webb

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک ہی نتیجہ پر منتہی ہوتے ہیں کہ زمان و مکان بدلتے رہے، قومیں دنیا کے سٹیج پر آتی اور جاتی رہیں، لیکن ہر دو قسم کے اصول نمودار ہوتے رہے۔ خود مادہ پرستانہ تمدن کبھی مصر اور شام میں جلوہ گر ہوا، کبھی عراق و ایران اس کے علم بردار بنے، کبھی روم اور یونان اس کے زیر اثر آ گئے، اور اب یہ مغربی اقوام پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ ان سب کے اندر ایک ہی تہذیب نے فکر و عمل کی ایک ہی لہر دوڑائی ہے اور سب اقوام —— جدید و قدیم —— کے سامنے ایک ہی طرح کے مسائل پیش کئے ہیں اور پھر انہوں نے ان تمام مسائل کو ایک مخصوص اندازِ فکر سے سلجھایا ہے۔ اس تمدن کے علمبرداروں میں، خواہ وہ کسی عہد اور کسی ملک کے رہنے والے تھے، بار بار ایک ہی طرح کے تموج رونما ہوتے رہے اور ان کے جذبات و احساسات میں ایک ہی نوعیت کے طوفان پھر پھر کر تلاطم برپا کرتے رہے۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ ان مختلف اقوام کے ظاہری اختلافات کے باوجود جن عقلی اور اخلاقی عناصر سے اس تمدن کی ترتیب ہوئی وہ ایک ہیں۔ چنانچہ ان کے فکر و عمل کا رقّاص اپنے مادّی چوکھٹے میں نصب ہونے کی وجہ سے قدرتاً صرف حیوانی زندگی کی لذت و مسرت کے مابین ہی رقص کرنے پر مجبور ہے۔

تکرار ایک فطری اصول ہے "تُوْلِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ" کا تماشہ صرف مٹی کے کرہ ہی پر نہیں، بلکہ انسان کی اجتماعی زندگی میں بھی دکھایا جا رہا ہے۔ جس طرح آب و گل کی دنیا کا کچھ حصہ رات کی تاریکی میں اپنا منہ چھپا لیتا ہے اور بقیہ حصہ سورج کی شعاعوں سے منور ہو جاتا ہے بالکل اسی انداز میں جب کبھی انسان کی اجتماعی زندگی پر دینِ حق کا آفتاب چمکنے لگتا ہے تو روشن دورِ تہذیب کی صبح نمودار ہوتی ہے۔ وہ تہذیب جو تسکین بخش ہے، جس میں جوہر انسانیت بدرجۂ کمال ہے، جو اپنے دامن میں استقامت اور صبر و سکون کے خزائن رکھتی ہے، جو انسانوں کے دامن کو ناجائز خود غرضی اور ناجائز نفع اندوزی سے پاک رکھتی ہے۔ اس کے برعکس جب رات کی تاریکی کی طرح ایک خدا ناشناس تمدن نوعِ انسانی کو اپنے بھیانک پردوں میں چھپا لیتا ہے تو انسانی زندگی پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ نوعِ انسانی کے سارے کے سارے سفلی جذبات ابھر کر سطح پر آ جاتے ہیں۔ وحشت و بربریت خواہ ترقی کے کیسے ہی خوشنما لباس پہن کر جلوہ افروز ہو، بہر حال دنیا کو اہلِ دنیا کے لئے جہنم بنا دیتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن دن رات کے چکر میں اور تمدنوں کی گردش میں ایک نہایت اہم فرق ہے، جس کو کسی صورت میں بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ عالم طبیعات قانونِ فطرت کے ایک اٹل قانون کا پابند ہے جس سے کسی صورت بھی مفر نہیں۔ ایک خاص وقفہ گزر جانے کے بعد رات کو بہرحال آنا ہے۔ پھر رات کے بعد صبح کو ضرور نمودار ہونا ہے۔ چکر کو کسی طرح روکا نہیں جا سکتا۔ مگر تہذیبوں کا معاملہ اور نظریات اور قوموں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ان سب کا محرک ایک ارادہ ہے جس کا تمام تر انحصار انسانوں کے اپنے انتخاب پر ہے۔ اس لئے اگر مختلف تمدنوں کو دنیا میں عروج و زوال آتا ہے تو یہ اُن کے علم برداروں کی توجہ اور عدم توجہ کا نتیجہ ہے۔ اہلِ مغرب نے ہزار ہا سالوں کی متعفن رومی تہذیب کو پھر سے زندہ کیا ہے۔ اور اگرچہ موجودہ دنیا اُس کے تلخ ثمرات کا بُری طرح مزہ چکھ چکی ہے مگر پھر بھی وہ اس وقت تک غالب ہے۔ کیونکہ اس کے فدائی ایک نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں انسان ہیں۔ وہ زندگی کے ہر مقصد کو اسی عینک سے دیکھتے ہیں۔ اپنی ہر مشکل کو اپنے تہذیبی اصولوں سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں انہیں اپنی تہذیب پر اعتماد ہے۔ محض قرطاس کے خزانہ میں محفوظ تمدن کبھی بھی زندگی کی نعمت کو پا نہیں سکتا۔ اس کی زندگی کے لیے ناگزیر ہے کہ ایسے انسان اٹھیں جو اپنے اعمال کی تصویر میں اس کے رنگ بھرنے کے لیے تیار ہوں۔ صرف تیار ہی نہ ہوں، بلکہ اس کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیئے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہ کریں۔

انسان کی اجتماعی زندگی میں سارا کھیل فکر و عمل کا ہے۔ کوئی تمدن بھی کسی قوم کی میراث نہیں۔ جو بھی جس طرف قدم اُٹھائے یہ اُس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ سارا معاملہ اس کے علمبرداروں کی نیّت، وابستگی، ایثار اور قوت کارکردگی پر منحصر ہے۔

حیوانی نقطۂ نظر اِسے انسان کی بدقسمتی کہیئے کہ جدید فلسفہ کی بنیاد ڈارون کی کتاب اصل الانواع (Origin of Species) پر رکھی گئی ہے جس کی رُو سے انسان کو بھی ایک حیوان سمجھا گیا ہے اور انسان کی اجتماعی زندگی کو ایک نظامِ جسمانی پر قیاس کر کے از خود فرض کر لیا گیا ہے کہ جو قانون انسانوں کی زندگی اور موت پر جاری ہے وہی تہذیب کی حیات و ممات پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ لہٰذا جو تہذیب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک دفعہ وجود میں آگئی ہے اُسے انسانی زندگی کی ساری منازل میں سے گزر کر بالآخر موت کی آغوش میں جاگرنا ہے حقیقت اس سے مختلف ہے۔ انسان کی اجتماعی زندگی، زندگی اور موت کے اس قانون طبعی کی پابند نہیں ہو سکتی۔ قوموں کی اجتماعی روح اپنے قالب تو بدل سکتی ہے مگر ختم نہیں ہو سکتی۔ اس پر تناسخ کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ایک قالب کو چھوڑتی اور دوسرے میں جاگزیں ہوتی ہے۔ مگر دنیا سے ناپید نہیں ہوتی۔ رومی مٹ چکے ہیں۔ یونانی دنیا کی امامت سے ہٹا دیے گئے ہیں۔ ایرانی و عربی خوشحالی کی زندگی بسر کر کے اس سے محروم ہو گئے ہیں۔ مگر ان کے مدفن میں ان کی تہذیبی روح کبھی دفن نہیں کی جا سکتی، وہ زندہ رہتی ہے اور جو قوم بھی اُس کو دعوت دے وہ اس کی آواز پر لبیک کہہ کر اُس کے جسم میں نشیمن بنا لیتی ہے۔ لیکن شپنگلر اور اُس کے ساتھیوں نے اس زبردست حقیقت کو نظرانداز کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ ایک تمدن جو ایک دفعہ فنا کے گھاٹ اُتر چکا ہے اُس کے بقا کی دوبارہ کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔

تمدن کا تحریکی نظریہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ جن لوگوں نے بھی تمدن سے متعلق یہ نظریہ پیش کیا ہے وہ ابھی تک یقین کے ساتھ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ تمدن کی طفولیت اور تمدن کے شباب سے اُن کی کیا مراد ہے۔ اُن کی سرحدیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں اور کہاں ختم ہوتی ہیں۔ ایک تمدن کب اور کس وقت آتا ہے۔ اور اس کی موت کا کیا مطلب ہے۔ اس نقطۂ نظر سے یہ بجھوری غیر واضح الفاظ کا ایک گورکھ دھندا ہے جس طرح ایک شخص ایک خاص طرز زندگی چھوڑ کر دوسرا طرز اختیار کر لیتا ہے تو یہ تبدیلی اس کی موت نہیں سمجھی جا سکتی، اسی طرح ایک تمدن کی ظاہری شکل میں کوئی معمولی تبدیلی اس کی موت نہیں سمجھی جا سکتی۔ تمدن ایک نظام جسمانی نہیں بلکہ یہ ایک تحریک ہے جو کمزور تو پڑ سکتی ہے مگر مٹ نہیں سکتی۔ افراد جلد جلد مٹنے والے ہیں۔ لیکن قومیں اپنی آئندہ نسلوں کے ذریعے اپنی زندگی کو دائمی بنا لیتی ہیں۔ ان کی زندگی غیر منقطع ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو عالم اسلام کے مفکر علامہ اقبال مرحوم نے رموزِ بے خودی میں استعارہ اور تشبیہ کی زبان میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ باوجود گل و نسترن کے مرجھا جانے کے فصل بہاراں باقی رہتی ہے۔ گوہر لعل کی کان میں سے اگر دو ایک گوہر نکل جائیں تو اس پر کچھ اثر نہ پڑے گا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ اس میں کسی قسم کی کمی محسوس کی جائے گی۔ خم ایام میں سے روز و شب ان گنت جام کے جام پے در پے میخواران حیات کو ملتے ہیں۔ لیکن وہ جیسا تھا ویسا ہی ہے۔ اس طرح ملت کی تقویم فرد کی تقویم سے جداگانہ ہے۔ اور اس کی مرگ و حیات کا قانون بھی مختلف ہے۔

فصلِ گل از نسترن باقی تر است　　از گل و سرو و سمن باقی تر است

کانِ گوہر پرورے گوہر گرے　　کم نہ گردد از شکست گوہرے

صبح از مشرق ز مغرب شام رفت　　جام صد روز از خمِ ایام رفت

بادہ ہا خوردند و صہبا باقی است　　دوش ہا خوں گشت و فردا باقی است

ہم چناں از فرد ہائے بے سپر　　ہست تقویم امم پایندہ تر

در سفر یار است و صحبت قائم است　　فرد رہ گیر است و ملت قائم است

ذات او دیگر صفاتش دیگر است　　سنتِ مرگ و حیاتش دیگر است

فرد بر می‌خیزد از مشت گلے　　قوم را صد سال مثل یک نفس!

یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل میں شپنگلر کے اسی نظریہ سے متعلق بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے "شپنگلر اپنے نظریہ تمدن کے مطابق یہ کہتے ہوئے کہ ہر تمدن ایک خاص نظام جسمانی ہے جس کا دوسرے تمدنوں سے جو پہلے گزر چکے ہیں کوئی دور کا بھی تعلق نہیں، یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جدید یورپین تہذیب روح کے اعتبار سے بالکل غیر کلاسیکی ہے، اور اس کے ثبوت میں وہ واقعات اور حقائق کو بری طرح مسخ کر کے پیش کرتا ہے۔ وہ ثابت کرتا ہے کہ یورپ کی غیر کلاسیکی روح یورپ کی مخصوص ذہانت کی رہین منت ہے جس میں اسلامی تمدن کی روح کو کوئی دخل نہیں ہے۔ میں نے ان لیکچروں میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید دنیا کی غیر کلاسیکی روح اسلام کی یونانی افکار کے خلاف بغاوت کی پیداوار ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ شپنگلر اس نظریہ کو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ موجودہ تمدن میں گزرے ہوئے تمدن کی روحانی تاثیر بھی شامل ہے، تو اس سے شپنگلر کے اس فلسفے کی کہ ہر تمدن اپنی اپنی جگہ خود مختار اور ایک دوسرے سے بے تعلق ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پوری عمارت پیوند خاک ہو جاتی ہے[1]۔ شپنگلر نے اپنے دعوے کی تائید حاصل کرنے کے لئے اسلام کی روح کو بحیثیت ایک تمدنی تحریک کے بالکل مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ موجودہ تمدن نے بہت کچھ عربوں سے لیا۔ عربوں کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں —— علی الخصوص علمی کتابوں —— پر پانچ چھ صدی تک یورپ کے کل دارالعلوموں کی تعلیم کا دارومدار رہا۔ بعض علوم میں مثلاً طب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربوں کا تسلط خود ہمارے زمانے تک رہا ہے۔ کیونکہ گذشتہ صدی کے آخر تک فرانس میں ابن سینا کی تصنیفات پر شروح لکھی جاتی تھیں۔ اسلامی تمدن نے یورپی تمدن کو اس حد تک متاثر کیا کہ موسیو لیبون کو لکھنا پڑا کہ

"تجربہ اور مشاہدہ کو اقوال اساتذہ کی روشنی کے مقابلہ میں تحقیقاتِ علمی کے اصول قرار دینا عموماً بیکن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، لیکن اس وقت تسلیم کر لینا چاہیے کہ اس کے موجد عرب تھے[2]۔"

(باقی)

۱۔ Reconstruction of Metaphysical Thought in Islam.

۲۔ تمدن عرب از گستاؤ لیبون۔

"فردوس" میں اہم تبدیلیاں

(۱) ماہنامہ "فردوس" کو عورتوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے ——●

(۲) "فردوس" کا دفتر اشاعت قائم گنج سے کانپور کو منتقل ہو گیا ہے ——●

(۳) "فردوس" کی پاکستانی رقمیں اب دفتر "ترجمان القرآن" (اچھرہ، لاہور) میں جمع ہوتی ہیں ——●

منیجر، ماہنامہ "فردوس" ہمایوں باغ - کانپور - یوپی - بھارت

© rasailojaraid.com